# سوشلزم کیوں؟

تحریر: آئن سٹائن

کیا یہ اس شخص کے لیے سوشلزم کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا معقول بات ہے جو معاشی اور سماجی مسائل کا ماہر نہیں، ؟ میرے نزدیک اس کی وجوہات یہ ہیں۔

سب سے پہلے ہم سائنسی نقطہ نظر سے اس سوال پر غور کرتے ہیں۔ ممکن تھا کہ فلکیات اور معاشیات کے طریق ہائے کار کے درمیان کوئی فرق نہ ہوتا۔ دونوں علوم کے سائنس دان اپنے اپنے میدانوں میں عمومی قوانین دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان مظاہر کے درمیان تعلق کو قابل فہم اور ممکن بنایا جاسکے لیکن حقیقتاً ایسے طریق ہائے کار میں فرق لازمی ہے۔ معاشیات کے میدان میں عمومی

قوانین کی دریافت ان حالات کی وجہ سے مشکل ہوئی جن کو علیحدہ کر کے [عدم ارتباط میں] جاننا مشکل ہے۔ مزید برآں یہ کہ انسانی تجربہ جو انسانی تاریخ کے مہذب دور سے ہی پروان چڑھا ہے ایسی وجوہات سے اجتماعی شکل اختیار کر سکا ہے جو کُلی طور پر معاشی نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر تاریخ میں بہت سی ریاستیں اپنے وجود کے لئے فتوحات کی مرہون منت رہیں۔ فاتح ملک کے لوگوں نے معاشی اور قانونی طور اپنے آپ کو امیر طبقے کے طور پر مستحکم کیا۔ انہوں نے زمینی ملکیت کی اجارہ داری قائم کی اور پیشوائی نظام کے عہدوں کو خود اپنے افراد میں بانٹ لیا۔ دینی پیشواؤں نے تعلیم پر اجارہ داری کی بنا ڈالی اور طبقاتی نظام کو مستقل ادارے کی شکل دے کر معاشرے کی گروہ بندی کا نظام وضع کر کے ایسی اقدار کو جنم دیا جس سے لوگوں کے رویے لاشعوری طور پر اسی شکل میں ڈھل گئے۔

یہ تاریخی روایت کل تک یہی تھی لیکن اب ہم نے انسانی ترقی کے اس

دور جسے Veblen Thorslein نے ’’غارت گر دور‘‘ ‘‘the predatory phase’’ کہا تھا، پر قابو پالیا ہے؟ قابل مشاہدہ معاشی حقائق اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں اور یہاں تک کہ ایسے قوانین جو ہم ان سے اخذ کرتے ہیں، وہ دوسرے ادوار پر قابل اطلاق نہیں ہیں۔ چونکہ سوشلزم کا حقیقی مقصد انسانی ترقی کے ’’غارت گر دور‘‘ کا جوا اتار پھینکنا اور اس کی دسترس سے باہر ترقی کرنا ہے، موجودہ دور میں معاشی سائنس مستقبل کی سوشلسٹ سوسائٹی پر روشنی ڈال سکتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ سوشلزم سماجی مقاصد کے حصول کے لئے ہے تاہم سائنس ایسے مقاصد کو جنم نہیں دیتی نہ ہی انہیں انسانوں کے ذہنوں میں ٹھونس سکتی ہے۔ یہ ان ذرائع کی تخلیق کرسکتی ہے جو ان مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہیں۔ یہ مقاصد ان شخصیات کے ذہن میں جنم لیتے ہیں جن کے بلند سماجی عزائم ہوتے ہیں۔ اگر یہ مقاصد

ساکت و جامد نہ ہوں، بلکہ فعال اور موثر ہوں، تو انہیں وہ انسان اپناتے ہیں جو قدرے لاشعوری طور پر معاشرے کے سست ارتقا کا تعین کرتے ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر ہمیں محتاط رہنا چاہیے تا کہ ہم سائنس اور سائنسی طریقِ کار کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہ دیں۔ ہمیں یہ مفروضہ قائم نہیں کرنا چاہیے کہ صرف ماہرین ہی یہ حق رکھتے ہیں کہ معاشرے کی تنظیم اور اس سے متعلقہ مسائل پر اظہارِ رائے کریں۔

جب کبھی ان گنت آوازیں پر زور دعویٰ کر رہی ہوں کہ اب انسانی معاشرہ نازک دور سے گزر رہا ہے اور اس کا استحکام بری طرح پاش پاش ہوا ہو، تو یہ ایسی صورت حال کا خاصہ ہے کہ افراد، چاہے وہ چھوٹے یا کسی بڑے گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، اس گروہ سے یا تو لاتعلق ہو جاتے ہیں یا پھر اس کی مخالفت کرنے لگ پڑے ہیں۔ اس کی وضاحت کے لیے میں ذاتی تجربہ بیان کرتا ہوں۔ حال ہی میں

میری ایک ذہین اور متمول شخص سے گفتگو ہوئی۔ میرے خیال میں ایک اور جنگ کا خطرہ، انسانی موجودگی کو شدید طور پر ایک نئے خطرے میں مبتلا کر دے گا۔ میری رائے تھی کہ انفرادی ممالک سے بالا کوئی تنظیم ہی اس خطرے سے بچاؤ کے لیے تحفظ فراہم کرے گی۔ اس پر میرے ملاقاتی نے بہت آرام وسکون اور ٹھنڈے مزاج سے کہا ”آپ کیوں نسلِ انسانی کی عدم موجودگی کی اتنی سخت مخالفت کرتے ہیں؟“

مجھے یقین ہے کہ سابقہ مختصر صدی میں کسی نے اتنا گھمبیر بیان اتنی سادگی سے نہ دیا ہوگا۔ یہ ایک ایسے آدمی کا بیان ہے جو اپنے آپ میں توازن قائم کرنے کی کوشش میں ناکام ہو گیا اور اس سلسلے میں اسے کامیابی کی کوئی امید بھی نہیں۔ یہ اکلاپے اور دکھ بھری تنہائی کا اظہار ہے جس سے بہت سارے لوگ ان دنوں گزر رہے ہیں۔

ایسے سوالات اُٹھانا، آسان کام ہے لیکن قابل یقین مثال کے ہمراہ

جواب دینا مشکل کام ہے۔ میں جتنی بہتر کوشش کر سکتا ہوں، کروں گا۔ اگرچہ میں حقیقت سے باخبر ہوں کہ ہمارے احساسات اور ہماری کوششیں اکثر متضاد اور مبہم ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ انہیں آسان اور سادہ طریقوں سے بیان بھی نہیں کیا جا سکتا۔

فرد ایک ہی وقت میں انفرادی اور سماجی وجود ہے۔ اپنے انفرادی وجود کے ناطے وہ اپنے اور ان لوگوں کے تحفظ کی کوشش کرتا ہے جو اس کے قریب رہتے ہیں اور اپنی خواہشات کو مطمئن کرنے اور اپنی باطنی قابلیتوں کو پروان چڑھانے کی کوششیں بھی کرتا ہے۔ سماجی انسان ہونے کے طور پر وہ دوسروں سے اپنی پہچان اور اپنے ساتھ رہنے والے لوگوں کی محبت کو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی خوشیوں میں شامل ہونے، ان کے دکھوں میں انہیں آرام پہنچانے اور زندگی کے حالات کو بہتر کرنے کی جستجو کرتا ہے۔ ان مختلف، اور بعض اوقات متحارب عوامل کی موجودگی ایک آدمی کے مخصوص کردار کو متعین کرتی

ہے اور ان کا مخصوص اجماع ایک فرد کے باطنی توازن کی سطح اور معاشرے کی فلاح میں اس کے حصے کا تعین کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان دونوں عوامل کی باہمی طاقت، وراثتی طور پر متعین ہو۔ لیکن آخر کار شخصیت کی تشکیل میں فیصلہ کن عنصر وہ معاشرتی وجود ہیں جس میں اس کا ارتقا ہوتا ہے۔ اس میں معاشرے کی ساخت شامل ہے، جس میں وہ پرورش پاتا ہے، اس معاشرے کی روایات اور رویوں کی مخصوص نمونہ جات شامل ہیں۔ ایک فرد کے لیے "معاشرے" کے تجریدی تصور سے مراد ایک فرد کے بالواسطہ اور بلاواسطہ تعلقات کا مجموعہ ہے، اس کے وہ تعلقات جو اس کے ہم عصر اور ابتدائی نسلوں کے سارے لوگوں سے مربوط ہوتے ہیں۔ فرد بذات خود سوچنے، محسوس کرنے، کوشش کرنے اور کام کرنے کے قابل ہوتا ہے لیکن وہ معاشرے پر طبعی ذہانت اور جذباتی موجودگی پر اتنا زیادہ انحصار کرتا ہے کہ اس کے بارے معاشرے کے ڈھانچے علاوہ جاننا ناممکن

ہو جاتا ہے۔ یہ معاشرہ ہی ہے جو آدمی کو خوراک، کپڑے، گھر، اوزار، زبان، خیال کی بنتریں اور خیال کا مافیہا مہیا کرتا ہے۔ اس کی زندگی ماضی اور حال کے ان گنت لوگوں کی محنت اور اس کے ثمرات سے ممکن ہوئی جو معمولی سے لفظ ''معاشرے'' میں پنہاں ہے۔

یہ امر واضح ہے کہ فرد کا معاشرے پر ایسی فطرتی سچائی ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا ہے ___ جیسے چیونٹیوں اور شہد کی مکھوں کا معاملہ ہے جب کہ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی زندگی کا دائرہ سخت گیر اور موروثی جبلتوں کے ذریعہ سے مختصر ترین معلومات کے لیے متعین ہے، انسانوں کی سماجی ساخت اور باہمی تعلقات کی نوعیت مختلف ہے اور تبدیلی کے عمل سے گزرتی ہے۔ یادداشت نئی جڑتیں اور وسعتیں پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ زبانی رابطوں کے تحفے نے انسانوں کے درمیان ترقی کو ممکن بنایا ہے جو حیاتیاتی ضرورت کے تحت نہیں۔ ایسی ترقیاں، اپنے آپ کا، روایات، اداروں اور تنظیموں میں، ادب،

سائنس اور انجینئرنگ کے کارناموں میں اظہار کرتی ہیں۔ اس سے یہ وضاحت بھی ہوتی ہے کہ ایک لحاظ سے ایک آدمی کا رویہ اس کی اپنی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس عمل میں سوچنے کی صلاحیت اور ضرورت کتنا کردار ادا کرتی ہے۔

آدمی، پیدائش کے وقت، موروثی طور پر ایک حیاتیاتی نظام حاصل کرتا ہے جسے ہمیں متعین اور ناقابل تغیر گردانا چاہیے۔ حیاتیاتی نظام میں فطری جبلتیں اور خواہشات بھی شامل ہیں جو کہ انسانی نوع کی خاصیتیں ہیں۔ مزید اپنی زندگی کے دوران وہ ایک ثقافتی نظام حاصل کرتا ہے جسے وہ معاشرے سے رابطے اور دوسرے کئی ایک اثرات سے اپناتا ہے۔ یہ وہ ثقافتی نظام ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قابل تغیر بن جاتا ہے اور جس کا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہونا ضروری ہے۔ یہ نظام کسی حد تک فرد اور معاشرے کے تعلق کا تعین کرتا ہے۔ جدید علمِ بشریات نے ہمیں قدیم ثقافتوں کے تقابلی

موازنے کے ذریعے بتایا ہے کہ ان میں موجود انسانی رویے مختلف ہو سکتے تھے جس کا انحصار غالب معاشرتی ساختوں اور معاشرتی تنظیم پر تھا جو الگ الگ معاشروں میں موجود تھی۔ وہ لوگ جو معاشرے کی تقدیر بدلنے کا عزم رکھتے ہیں اور اسے بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، یقین رکھتے ہیں کہ بیچارگی اور دکھ بنی انسان کی تقدیر نہیں، نہ ہی بہتر معاشرے میں ان کی حیاتیاتی بنت حائل ہے جس کی رو سے وہ ایک بے رحم تقدیر کے ہاتھ مجبور ہیں۔

اگر ہم اپنے آپ سے پوچھیں کہ معاشرے کی ساخت اور آدمی کے ثقافتی رویوں کو کیسے تبدیل ہونا چاہیے جس سے انسانی زندگی سکھ کا گہوارا ہو۔ اس مقصد کے لیے ہمیں حقیقت سے مسلسل آگاہ ہونا چاہیے کہ یہاں کون سے ایسے حالات ہیں جو اصلاح کے قابل نہیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ انسان کی حیاتیاتی فطرت کو تمام عملی مقاصد کے لیے تبدیل کرنا ضروری نہیں ہے۔ مزید برآں یہ

ہے کہ چند سابقہ صدیوں کی تکنیکی اور فنی ترقی نے ایسے حالات پیدا کیے ہیں جو چاہے ناپسندیدہ ہوں بھی بہرحال موجود رہیں گے۔

گنجان آبادی کے علاقے جن میں ان کی بقا کے لئے مختلف اشیا کا ہونا ناگزیر ہے، وہاں محنت کی انتہائی تقسیم اور ایک اعلیٰ درجے کا مرکزی نوعیت کا پیداواری ڈھانچہ بہت ضروری ہے۔ وہ وقت بیت گیا جب چین کی بنسی بجتی تھی، اور جس میں نسبتاً چھوٹے گروہ خود انحصاری کی زندگی گزار سکتے تھے۔ یہ کہنا معمولی مبالغہ آمیزی ہے کہ انسانیت اب عالمی سطح پر قائم پیداوار کرنے اور صرف کرنے والا ڈھانچہ ہے۔

اب میں اس نکتے پر پہنچ گیا ہوں جہاں میں اپنے دور کے بحران کے اصل کی نشاندہی کرسکتا ہوں۔ اس بات کا تعلق فرد کا معاشرے سے رشتے پر ہے۔ فرد معاشرے پر اپنے دوامی انحصار کے معاملے میں زیادہ باخبر ہوگیا ہے لیکن اسے اس انحصار کے مثبت اثاثے، عضوی

جز و اور محفوظ قوت کے طور پر تجربہ نہیں ہوا، لیکن وہ اس انحصاریت کو مثبت چیز نہیں گردانتا، اسے بطور لازمی تعلق، تحفظ دینے والی قوت نہیں لیتا، بلکہ اسے اپنے فطرتی حقوق بلکہ معاشی وجود کے لئے خطرہ سمجھتا ہے۔ مزید براں اس کے وجود کی انانیت سے بھرپور جبلتیں مسلسل شہہ پاتی ہیں اوراس کے سماجی رویے جو فطرتی طور پر کمزور ہیں مزید کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ تمام انسان، چاہے وہ معاشرے کے کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں تخریب کے اس عمل سے گزر رہے ہیں۔ دانستہ طور پر خود پسندی میں گرفتار ہوکر وہ خود کو غیر محفوظ، تنہا اور زندگی کی سادہ مسرتوں سے محروم سمجھتے ہیں۔ زندگی چاہے مختصر اور خطرات سے پُر ہے، آدمی اس کو بامعنی تب ہی بنا سکتا ہے جب وہ خود کو معاشرے کے لئے وقف کردے۔

میرے خیال میں سرمایہ دارانہ معاشرے میں موجود برائی کا اصل مدعا اس کے معاشی بحران میں ہے۔ یہ آج کے دور میں واضح ہے۔ ہم

اپنے سامنے اشیا پیدا کرنے والوں کا ایک وسیع معاشرہ دیکھتے ہیں جو مسلسل اس کوشش میں ہیں کہ ایک دوسرے کو اجتماعی محنت کے ثمرات سے محروم کر دیا جائے۔ یہ قوت کے بل بوتے پر نہیں کیا جاتا بلکہ موجود قانونی ضابطوں کو استعمال میں لا کر اس مقصد کو حاصل کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ جاننا ضروری ہے کہ تمام پیداواری قوتیں، یعنی پیداواری صلاحیتیں جو اشیائے صرف کے ساتھ ساتھ اضافی اشیائے سرمایہ کی پیداوار کے لیے درکار ہیں، قانونی طور پر افراد کی نجی ملکیت ہیں۔

بیان کو سادہ بنانے کی خاطر، میں آئندہ گفتگو میں ’مزدور‘ سے مراد وہ تمام لوگ لوں گا جو کہ ذرائعِ پیداوار کے مالک نہیں۔ اگرچہ یہ حد بندی کے اس اصطلاح کے عام استعمال سے قدرے مختلف ہے۔

پیداوار کے ذرائع کا مالک اس حالت میں ہے کہ مزدور کی محنت کو خرید لے۔ پیداوار کے ذرائع استعمال کرنے سے، مزدور نئی اشیا پیدا

کرتا ہے جو کہ سرمایہ دار کی ملکیت بن جاتی ہیں۔ اس عمل کے متعلق ضروری نکتہ یہ ہے جو شے مزدور پیدا کرتا ہے اور جو معاوضہ اسے ادا کیا جاتا ہے، دونوں کو حقیقی قدر کے تعلق کے حوالے سے ماپا جاتا ہے۔ جہاں تک محنت کا یہ معاہدہ 'آزاد' ہے، مزدور جو کچھ معاوضہ پاتا ہے اس شے کی اصل قدر سے طے نہیں پاتا، بلکہ مزدور کی کم از کم ضروریات اور مزدوری کے لئے مقابلے میں آنے والے مزدوروں کے تناسب سے سرمایہ دار کی قوت محنت کے لئے طلب سے طے پاتی ہے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مزدور کا معاوضہ معاشی نظریے کی رو سے بھی اس کی بنائی ہوئی مصنوعہ کی قدر سے طے نہیں پاتا۔

نجی سرمایہ چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جاتا ہے۔ جزوی طور پر اس کی وجہ سرمایہ داروں کے درمیان مقابلہ ہے اور جزوی طور پر اس کی وجہ ٹیکنالوجی کا ارتقا ہے۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ محنت کی تقسیمِ کار چھوٹے پیداواری یونٹوں کو ختم کر کے بڑے بڑے پیداواری یونٹ تشکیل

دیتی ہے۔ اس ارتقا کا نتیجہ، نجی سرمایہ دار کی سلطنت کا ظہور ہے جس کی قوت کو جمہوری سیاسی معاشرے کے ادارے بھی قابو میں نہیں لا سکتے۔ یہ سچ ہے کہ چونکہ قانون سازاداروں کے ارکان سیاسی جماعتیں سے منتخب ہوتے جنہیں بڑے پیمانے پر نجی سرمایہ داروں سے چندے ملتے ہیں یا وہ کئی اور طریقوں سے ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عملی طور پر قانون سازی انتظامیہ سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے نمائندگان کو آبادی کے مظلوم طبقات کے مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ مزید براں موجودہ حالات میں نجی سرمایہ دار ابلاغ عامہ کے اکثر ذرائع (پریس، ریڈیو، تعلیم) پر بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر لازماً قابض ہوتے ہیں۔ ان حالات میں ایک انفرادی شہری کے لئے معروضی نتائج تک پہنچنا اور اپنے سیاسی حقوق کو استعمال میں لانا کافی حد تک مشکل ہے بلکہ اکثر صورتوں میں ناممکن ہے۔

سرمایے کی نجی ملکیت پر قائم معیشت کی موجودہ صورت حال کے دو امتیازی وصف ہیں: پہلا اصول یہ ہے کہ پیداوار کے ذرائع ذاتی ملکیت ہیں اور مالکان اسے اپنی مرضی کے مطابق استعمال میں لاتے ہیں۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ محنت کا معاہدہ 'آزاد' ہے۔ یقیناً اس لحاظ سے خالص شکل میں سرمایہ دارانہ معاشرے کا وجود نہیں۔ خصوصی طور پر اس بات کو توجہ دینی چاہیے کہ طویل اور تلخ سیاسی جدوجہد کے ذریعے، مزدور، مزدوروں کے عام گروہوں کے لیے "آزاد محنت کے معاہدے" کی بہتر شرائط کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، لیکن مجموعی طور پر موجودہ دور کی معیشت خالص سرمایہ دارانہ نظام سے مختلف نہیں ہے۔

پیداوار، منافع حاصل کرنے کے لیے جاری ہے مگر صرف کے لیے نہیں۔ ایسی کوئی سہولت نہیں کہ وہ تمام لوگ جو کام کرنے کے قابل بھی ہیں اور اہل بھی روزگار حاصل کر پائیں گے۔ بے روزگاری کے

گروہ ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ مزدور، اپنی ملازمت کے چھوٹ جانے کے خوف میں ہمیشہ مبتلا رہتا ہے۔ چونکہ بے روزگار اور غریب تنخواہ دار مزدور ایک قابل منافع مارکیٹ مہیا نہیں کرتے، اشیائے صرف کی پیداوار محدود ہو جاتی ہے اور نتیجتاً ایک بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تکنیکی ترقی تقریباً سب لوگوں کے لیے کام کے بوجھ کو گھٹانے کے بجائے مزید بے روزگاری کو جنم دیتی ہے۔ منافع کی ہوس، سرمایہ داروں کے درمیان مقابلے سے مل کر، سرمائے کی استفادہ کاری اور ارتکاز میں غیر مستحکم پن کا ذمہ دار ہے۔ غیر محدود مقابلہ، محنت کے وسیع ضیاع اور افراد کے سماجی شعور کے بحران کی طرف لے کر جاتا ہے جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

فرد کی انفرادیت کو مسخ کرنا، میرے خیال میں، سرمایہ دارانہ نظام کا بدترین شاخسانہ ہے۔ ہمارا تمام تر تعلیمی نظام اس برائی میں مبتلا ہے۔ مبالغہ کی حد تک مقابلے کے رجحان کو طالب علم کے ذہن میں

بٹھا دیا جاتا ہے جو کہ اس طرح حاصل کی گئی کامیابی کو اپنے مستقبل کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔

میرے خیال میں ان برائیوں کے خاتمے کا ایک ہی حل ہے کہ سوشلسٹ معاشرہ قائم کیا جائے۔ ساتھ ہی اس طرح کا تعلیمی نظام اپنایا جائے جس کا رجحان معاشرتی مقاصد کی طرف ہو۔ ایسی معیشت میں، پیداوار کے ذرائع بذات خود معاشرے کی ملکیت ہو جاتے ہیں اور انہیں منصوبے کے تحت استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ایک منصوبہ بند معیشت جو پیداوار کو انسانی، معاشرتی ضروریات سے ہم آہنگ کرتی ہے ان لوگوں میں محنت کی تقسیم کرے گی جو محنت کرنے کے اہل ہوں گے اور ہر مرد، عورت اور بچے کو ذریعہ معاش کی ضمانت فراہم کرے گی۔ فرد کی تعلیم، اس کی باطنی صلاحتیوں کو بڑھانے کے علاوہ اس میں دوسرے انسانوں کے لئے احساس ذمہ داری کو بڑھاوا دے گی بجائے اس کے کہ وہ موجود دور میں طاقت اور

کامیابی کی ستائش کو ہی سب کچھ سمجھے۔

پھر بھی یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ایک منصوبہ بند معیشت سوشلزم نہیں ہے۔ یہ خطرہ موجود رہتا ہے کہ ایک منصوبہ بند معیشت میں فرد کی مکمل غلامی بھی آن ٹپکے۔ سوشلزم کی کامیابی، معاشرتی، سیاسی مسائل کے حل کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ جب معاشی اور سیاسی قوت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جائے تو بیوروکریسی کو کُلی طور پر طاقت ور اور متکبر ہونے سے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ فرد کے حقوق کو کیسے محفوظ کیا جا سکتا ہے؟ اور جمہوری قوت کے ذریعے بیوروکریسی کی قوت کو کیسے قابو میں لایا جا سکتا ہے؟

تبدیلی کے اس دور میں سوشلزم سے متعلقہ مسائل کے بارے آگاہ ہونا بہت ضروری ہے۔ چونکہ موجودہ حالات میں ان موضوعات پر بحث مباحثہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، میرے خیال میں آپ کے رسالے (Review Monthly) کا اجراء عوامی خدمت

میں اہم کردار ادا کرے گا۔

*(یہ مضمون ReviewMonthly کے پہلے شمارے، مئی 1949 میں شائع ہوا)*